جنگجو اسلام سے امریکہ کا اتحاد

رابن بلیک برن*

تلخیص: فخرالاسلام

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے کم و بیش ایک مہینے بعد یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی کہ امریکہ کے چند دوست ممالک القاعدہ اور طالبان کی ہر ممکن مدد کرتے رہے ان میں سعودی عرب، پاکستان اور متحدہ عرب امارات شامل تھے۔ سال ۲۰۰۰ء میں خود امریکی حکومت نے ''منشیات کے خلاف جہاد'' میں تعاون کے نام سے طالبان حکام کو بیالیس ملین ڈالر کی امداد فراہم کی۔ امریکہ نے یہ سب کچھ اس حقیقت کے باوجود کیا جبکہ امریکی عدالتیں ۱۹۹۸ء میں مشرقی افریقہ کے سفارت خانے میں دھماکوں کی ذمہ داری القاعدہ پر عائد کر چکی تھیں نیز افغانستان میں القاعدہ کے تربیتی کیمپوں کی موجودگی طشت از بام ہو چکی تھی۔

امریکی فوج اور سراغ رساں اداروں کے سعودی عرب اور پاکستانی سیکورٹی سروسز کے ساتھ گہرے مراسم چلے آ رہے ہیں۔ ان مراسم کا سبب یہ تھا کہ سعودی عرب تیل کی دولت سے مالا مال تھا جبکہ پاکستان کی سرحدات افغانستان سے ملی ہوئی تھیں۔ چنانچہ ان دو ممالک کے مالی تعاون اور تربیت کے طفیل طالبان نے ۱۹۹۶ء میں مجاہدین سے اقتدار چھین لیا۔ بایں ہمہ طالبان اُسامہ بن لادن سے بھی مالی نقصان حاصل کرتے رہے جس کے صلہ میں موخرالذکر کو افغانستان میں تربیتی مراکز کھولنے کی اجازت دی گئی۔ افغانستان میں روس کے خلاف مزاحمت کے دوران سعودی انٹیلی جنس کے سربراہ شہزادہ ترکی الفیصل نے امریکی منظوری کے ساتھ، اُسامہ بن لادن کو متعارف کرایا (شہزادہ موصوف کو ۱۱ستمبر سے دو مہینے قبل پراسرار طور پر اپنے عہدے سے سبکدوش کر دیا گیا۔)

اُسامہ بن لادن سعودی عرب سے جو سرمایہ اپنے ساتھ لاتے رہے پاکستان کا فوجی سراغرساں

---

*Robin Blackburn, "The US Alliance with Militant Islam", in *Terror and Empire*, //http://www.counterpunch.org/robin3.html//

ادارہ آئی ایس آئی اس میں سے اپنا حصہ وصول کرتا رہا۔ ''نیو ریپبلکن'' نامی روزنامے کے ۲۴ ستمبر والے شمارے میں مارٹن پیریز نے لکھا کہ سعودی شیوخ اور شاہی خاندان والے اسامہ کو فراخدلی سے امداد اس لیے فراہم کرتے تھے کہ اس طرح ان کو ملک سے باہر مصروف رکھنا ممکن تھا۔ اس طرح تھامس فرائیڈ مین نے نیویارک ٹائم کے ۲۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے شمارے میں لکھا کہ سعودی عرب نے اپنے ہاں اسلام پسندوں کو سرمایہ اکٹھا کرنے کی بھی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ یہ سرمایہ بظاہر تو سماجی بہبود پر خرچ ہوتا تھا لیکن آخر میں معلوم ہوا کہ اسامہ بن لادن اس سے مستفید ہوتا رہا۔ چندہ اکٹھا کرنے والے اسلام پسندوں سے یہ وعدہ لیا گیا تھا کہ وہ سعودی عرب کے اندر کوئی تخریبی کارروائی نہیں کریں گے۔ اسلامی خیراتی اداروں کے اسی کردار کے بارے میں سیمور ہرش نے بھی ''نیویارکر'' میں ایک تفصیلی رپورٹ شائع کی۔

سعودی عرب اس وقت دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ایسے ساٹھ اسلامی مراکز کے اخراجات برداشت کر رہا ہے جو شدت پسند وہابی فرقے کا پرچار کرتے ہیں۔ یہ اس امداد کے علاوہ ہے جو بے شمار اسلامی مدارس کو دی جاتی ہے۔ یہ مدارس بھی وہابی فرقے اور جہاد کی تعلیم دیتے ہیں۔ اگرچہ سعودی عرب کی آبادی کا صرف پانچ فیصد وہابیت سے وابستہ ہے تاہم غیر مسلموں کے خلاف نفرت کا بیج وہابی نظام تعلیم نے بویا ہے۔ امریکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں سعودی عرب کو ساتھ لے کر چل رہا ہے لیکن اس حوالے سے دونوں ممالک میں نظریاتی اختلاف موجود ہے۔ ولی عہد شہزادہ عبداللہ کو امریکہ کا سخت مخالف تصور کیا جاتا ہے۔ ان کی تخت نشینی کو روکنے کے لیے معذور شاہ فہد کو اپنے عہدے پر برقرار رکھا گیا ہے۔ شاہ فہد کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو پہچاننے سے قاصر ہیں لیکن امریکی محکمہ اطلاعات نے ان کے ساتھ سیکرٹری دفاع رمزفیلڈ کی تصویر شائع کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گویا دونوں رہنما ۱۱ ستمبر کے واقعے کے حوالے سے کوئی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

سعودی عرب بے پناہ تیل کی دولت کے باوجود مطلوبہ اقتصادی اور سماجی ترقی نہیں کر سکا ہے جس کے نتیجے میں اس کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں مایوسی پھیل رہی ہے۔ یہ نوجوان درمیانے طبقے کے طور پر ابھرنا چاہتے ہیں لیکن بوجوہ ایسا نہیں کر پائے۔ ان کے مقابلے میں پھر وہ نوجوان ہیں جن کے والدین بدعنوان اور استبدادی نظام کے دست و بازو ہیں۔ سعودی مطلق العنان حکمران اب وہابیت کے اثرات کم

کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں اور ان لوگوں کو قابو کرنے کے لیے سخت عدالتی نظام کے ذریعے دہشت بھی پھیلا رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ۱۱ ستمبر کے واقعے کے ہائی جیکروں میں سے ۱۵ کا تعلق سعودی عرب، جبکہ باقیوں کا تعلق امارات یا پھر مصر سے تھا۔ ان ممالک میں مسلط جامد اور بدعنوان مطلق العنانیت مڈل کلاس کے لوگوں میں مایوسی کو پروان چڑھا رہی ہے جس کے نتیجے میں ایک شدت پسند گروہ پیدا ہوا ہے۔

ابتداء میں پاکستانی اور سعودی حکام القاعدہ سے خائف اور مناسب فاصلے پر رہتے تھے۔ ان کے درمیان رابطے کا ذریعہ خیراتی ادارے ہوا کرتے تھے، تاہم طالبان کے منظر عام پر آنے سے ان میں قربتیں بڑھ گئیں۔ ہر دو ممالک نے طالبان کی حمایت رضا کارانہ طور پر کی یعنی اس حمایت کے بدلے وہ ان جنگجوؤں کو خریدنا نہیں چاہتے تھے۔ طریقہ کار یہ اپنایا گیا کہ سعودی ایجنسیاں دولت اور اسلحہ فراہم کرتی رہیں جبکہ پاکستانی آئی ایس آئی نے تربیت اور فوجی ماہرین مہیا کیے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ پاکستان و سعودی عرب کی مدد کے بغیر نہ تو طالبان برسر اقتدار آ سکتے تھے اور نہ اُسامہ بن لادن کے لیے تربیتی کیمپوں کا جال بچھانا ممکن تھا۔ ادھر طالبان کے رہنما ملا محمد عمر نے القاعدہ کے ساتھ متوازی اتحاد بھی قائم کر لیا جس کے پیچھے دو مقاصد تھے۔ اول یہ کہ القاعدہ پیسے اور مجاہدین مہیا کر رہی تھی۔ ثانیاً ایسا کر کے ملا عمر سعودی عرب اور پاکستان پر کلی انحصار کم کرنا چاہتے تھے۔ پاکستان اور سعودی عرب طالبان اور القاعدہ کی اس قربت سے ناخوش تھے لیکن اُنہوں نے طالبان کے اس منصوبے کی کھل کر مخالفت نہیں کی۔ ۱۱ ستمبر کے واقعے کے بعد امریکی حکام اس ساری صورت حال سے باخبر تھے۔ چنانچہ اسلام آباد میں مقیم نیویارک ٹائمز کے نمائندے جان برنس نے اپنے مراسلے میں لکھا:

> ''پاکستان کے آئی ایس آئی ڈائریکٹوریٹ نے طالبان کو بڑے پیمانے پر اقتصادی اور فوجی تعاون مہیا کیا۔ ۱۱ ستمبر تک امریکی حکام آئی ایس آئی کے اس کردار کو برداشت کرتے رہے باوجود یہ کہ وہ طالبان کی پرتشدد اسلامی حکمرانی کے خلاف تھے''۔

امریکی حکام یہاں تک کہتے ہیں کہ آئی ایس آئی کے القاعدہ سے بھی بالواسطہ روابط تھے۔ اس ایجنسی نے القاعدہ کے تربیتی کیمپوں میں ایسے لوگوں کو تربیت دی جنہیں بعد میں بھارت کے خلاف خفیہ دہشت گرد کارروائیوں میں استعمال کیا گیا۔

۱۹۹۸ء میں سفارت خانے میں بم دھماکے کے بعد وزارت خارجہ کے افسر مائیکل شینان نے امریکی حکام پر زور دیا کہ وقت آ گیا ہے کہ القاعدہ کو تنہا کر دیا جائے۔ مائیکل نے پاکستان، افغانستان، سعودی عرب، امارات اور یمن کے سلسلے میں کئی اقدامات تجویز کیے جن کے تحت ان ممالک سے القاعدہ کو تنہا کرنے کی مدد طلب کی گئی تھی۔ مائیکل کے مقالے کا عنوان تھا ''پاکستان کی کلیدی حیثیت'' جس میں یہ بھی تجویز کیا گیا تھا کہ انتظامیہ کو اسلام آباد کے تعلقات کو دہشت گردی سے مشروط کر لینا چاہیے۔ اس دستاویز میں انتظامیہ سے یہ بھی کہا گیا کہ دہشت گردوں کو سرمایہ کی منتقلی کا راستہ بند کر دیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شینان کی اس دستاویز کو انتظامیہ نے درخور اعتنا نہیں سمجھا۔

واشنگٹن طالبان کے مذہبی عقیدے سے بے خبر نہیں تھا تاہم اس کا خیال تھا کہ مسلمان شدت پسند نسبتاً بہتر اتحادی ثابت ہو سکتے تھے جن سے معاملہ کرنا آسان تھا۔ وہ دراصل سیکولر حکومتوں سے شاکی تھا جو کسی صورت میں امریکی خواہشات کی پیروی کے لیے تیار نہیں تھے، بالفاظ دیگر وہ اسلامی جہاد اور اُسامہ کو منفی مظہر نہیں سمجھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں ان تنظیموں کو سرمایہ، تربیت اور اسلحہ کی صورت میں مدد فراہم کی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ افغانستان میں روسی حمایت یافتہ حکومت کے خلاف لڑیں۔ انہی کوششوں کی کڑی کے طور پر ۱۹۸۹ء میں نہ صرف القاعدہ تنظیم کی داغ بیل ڈالی گئی بلکہ جو اسلام پسند سویت یونین کے زیر اثر علاقوں اور مشرق وسطیٰ میں مصروف تھے انہیں بھی امریکہ کی اشیر باد حاصل تھی۔ القاعدہ تنظیم کے عناصر چیچنیا اور سابق سوویت وسط ایشیا میں کارروائیاں کر رہے تھے اور وہ بوسنیا اور کوسووا میں بھی مصروف عمل تھے۔ مغربی پریس نے اگرچہ اس رجحان کا نوٹس نہیں لیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ بوسنیا اور کوسووا کی تحریک آزادی (KLA) کے بعض لوگ دہشت گردی میں ملوث تھے۔ اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ اب بھی بلقان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں لسانی اور مذہبی گروہ مقامی آبادیوں کو تشدد کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ علاقے منشیات کی تجارت کی گزرگاہ بھی ہیں جو افغانستان سے مغربی یورپ کی طرف ہو رہی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۲۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو اکنامسٹ جریدے کے مطابق اوسلو پولیس نے جب ناروے کی تاریخ میں ہیروئن کی سب سے بڑی مقدار برآمد کر لی تو ان کو منکشف ہوا کہ منشیات کی ترسیل کا یہ نظام کوسووا جنگ آزادی کے لوگ کنٹرول کر رہے تھے۔

امریکہ نے ۱۹۹۳ء کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر بم دھماکے اور افریقی سفارت خانے کے واقعے سے قبل ہی بن لادن کی نگرانی شروع کی تھی۔ صدر کلنٹن نے سرمائے کی ترسیل روکنے کے لیے کانگریس کی منظوری حاصل کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ اس سے دہشت گردی کی کارروائیاں فروغ نہ پائیں۔ صدر کی ان کوششوں میں ٹکساس سے ریپبلکن سینیٹر فل گرام نے رکاوٹ ڈالی تھی اس وقت فل گرام سینیٹ کی بینکنگ کمیٹی کے چیئرمین تھے۔ فل گرام ۱۱ ستمبر کے واقعے کے بعد بھی اپنے موقف پر ڈٹے رہے اُنہوں نے برملا کہا:

''بل کی مخالفت کے حوالے سے میرا موقف اب یہی رہی ہے۔ دہشت گردوں کا واحد علاج یہ ہے کہ انہیں چن چن کر قتل کر دیا جائے (نہ کہ ان کے آڑ میں سرمایہ کی منتقلی کے راستے مسدود کر دیے جائیں)''۔

سعودی عرب کے مذہبی اور دیگر ممالک کے سیکولر حکام بھی سرحدات کے آر پار سرمایہ کی آزادانہ منتقلی کے حامی ہیں۔ سعودی عرب شاید واحد ملک ہے جہاں حصول سرمایہ، وراثت اور آمدنی پر کوئی ٹیکس عائد نہیں۔ ''بزنس ویک'' نامی جریدے نے صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ بظاہر تو سعودی عرب کا معاشرہ سخت پابندیوں کا مظہر نظر آتا ہے لیکن اس کا حنبلی فقہ نجی ملکیت کے تقدس پر پختہ یقین رکھتا ہے۔ لندن کے مائیکل فیلڈ نے اسی فقہ کی وضاحت میں لکھا: ''آپ اپنی دولت کا کیسے استعمال کریں؟ یہ آپ ہی کا اختیار ہے''۔

فرانسیسی دانشور میکسن روڈینسن نے اپنے مقالے ''اسلام اور سرمایہ داری'' میں تجارتی اور اقتصادی ذخیرہ اندوزی کے ساتھ اسلام کی مطابقت سے بحث کی ہے۔ ایرانی انقلاب کے ابتدائی دنوں میں اسلامی اقتصادیات میں ریاست کی دخل اندازی کا رجحان دیکھنے میں آیا لیکن اولیور رائے کے مطابق اس کے متوازی ریاستی مداخلت سے آزاد تصور پر مبنی معاشی نظام بھی کام کرتا رہا اور یہ صرف ایران ہی کا معاملہ نہیں تھا پوری اسلامی دنیا میں یہ نظام کارفرما رہا۔ فاضل مصنف کی رائے میں معیشت کے اس تصور نے کاروباری طبقے، طلباء اور معاشی ماہرین کی بڑی تعداد کو بنیاد پرستی کا ہم نوا بنالیا۔ ۲۰۰۱ء میں ''بینک اقتصادی نوین'' کے نام سے ایران میں پہلا نجی بینک قائم کیا گیا۔ توقع ہے کہ مستقبل دیدہ میں اس نوعیت کے اور

بھی بینک کھلیں گے۔ یہی حال سعودی عرب اور خلیجی ممالک کا بھی ہے جہاں متعدد اسلامی بینک قائم ہیں۔

اسلامی کاروباری حضرات بلاسود کاروبار کے حوالے سے کافی احتیاط برت رہے ہیں۔ وہ سود کی بجائے سہ ماہی اور سالانہ بنیادوں پر بونس وصول کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ سٹاک اور حصص کے کاروبار میں سرمایہ کاری کو ترجیح دیتے ہیں جہاں نفع ونقصان میں شراکت کا اصول کارفرما ہے۔ مصنف اس مرحلے پر سعودی عرب میں تجارتی اور اقتصادی سرمایہ داری کی اسلام سے موافقت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سعودی معیشت مقررہ منافع پر انحصار کرنے والی طفیلی معیشت ہے جو معاشی نمو کو فروغ نہیں دے پا رہی۔ سرکاری کنٹرول کے تحت چلنے والے ادارے SABIC، سعودی ایئر لائنز اور سعودی آرامکو ہیں جن میں موخرالذکر کی سالانہ آمدنی ۸۰ بلین ڈالر ہے۔ اسلام پسندوں کا مطالبہ ہے کہ ان اداروں کو شاہی تسلط سے آزاد کرا کر ایمان دار اسلامی کاروباریوں اور فاؤنڈیشنوں کے حوالے کیا جائے۔ اس مطالبے کی حمایت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

القاعدہ تنظیم کو اعلیٰ درجے کے بینکاری نظام تک رسائی حاصل ہے جسے وہ بڑی مہارت سے انتقال سرمایہ کے اس خفیہ اور غیر رسمی نظام سے مربوط کیے ہوئے ہیں۔ جہاں حوالہ اور ''بااعتماد دلالی'' جیسے طریقے مستعمل ہیں۔ اس غیر رسمی نظام کے ذریعے خلیج سے برصغیر پاک و ہند، شمالی امریکہ اور یورپ کو بہت بڑی رقوم منتقل کی جاتی ہیں۔ اس نظام کے خفیہ الفاظ اور اصطلاحیں ہوتی ہیں (بطور مثال فون یا ای میل پر یہ پیغام کہ عبداللہ کو آموں کے بارہ کریٹ دیجیے)۔ دلال لوگ حسابات زبانی رکھتے ہیں اور اس طرح مخالف سمت سے آئی ہوئی رقم سے ادائیگی کا توازن قائم کرتے ہیں۔

''نیٹ ورک سوسائٹی'' نامی کتاب کے مصنف مینوئیل کیسٹل کا کہنا ہے کہ انتقالِ سرمایہ کا یہ غیر رسمی نظام ایک اور جال سے منسلک ہے۔ پھر یہی جال آگے سے لچکدار مارکیٹوں، سرمایہ دارانہ زرکشی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی سے مربوط ہے۔ القاعدہ کے پاس بہت زیادہ ترقی یافتہ نیٹ ورک موجود ہے۔ اُسامہ بن لادن بذاتِ خود اقتصادی، بینکاری اور تعمیراتی کاموں کے ماہر ہیں۔ یہاں تک کہ افغانستان میں ان کے زیر استعمال غاروں میں بھی انہیں جنریٹروں، کمپیوٹروں اور اطلاع رسانی کے آلات کی سہولتیں میسر تھیں۔ وہاں کا دورہ کرنے والے ایک عرب صحافی نے کہا:

''اس آدمی کے گرد مختلف عمروں کے عرب مجاہدین جمع ہیں جن میں زیادہ تعداد نوجوانوں کی ہے۔ان کے پاس طب، انجینئرنگ اور تعلیم سمیت سائنس کی اعلیٰ ڈگریاں ہیں''۔

ایمپائر نامی کتاب کے مصنفین مائیکل ہارڈٹ اور انتونی نیگری کا کہنا ہے کہ القاعدہ نے جس طریقے سے امریکہ کو چیلنج کیا ہے اس کا جواب امریکہ اپنی برخود غلط عالمگیریت سے دے رہا ہے جس کے تحت وہ اپنے آپ کو انسانی تہذیب کا نگہبان سمجھتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ واشنگٹن ماسکو اور بیجنگ کے ساتھ مفاہمت قائم کرنے میں کامیاب ہوا ہے (یاد رہے کہ یہ مضمون خلیج کی جنگ دوم ۲۰۰۳ء سے پہلے لکھا گیا)۔لیکن اس کو اسلامی دنیا میں بھی قابل اعتماد دوست تلاش کرنے چاہییں۔غالباً فی الوقت امریکہ کو ایسے دوست میسر نہیں۔

[رابن بلیك برن امریکی رسالے *New Left Review* کے سابق ایڈیٹر اور دی نیو سکول، نیویارك میں وزیٹنگ پروفیسر ہیں۔]